جناب محمد طفیل

البیرونی کے عہد کا ہندوستانی معاشرہ

علمائے عمرانیات کے ہاں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ سب سے پرانی تہذیب کونسی ہے اور سب سے پہلا تمدن کہاں سے اُبھرا۔ پرانی تہذیبوں میں ہندوستانی تہذیب بھی شامل ہے۔ اس بحث میں پڑے بغیر کہ ہندوستانی تہذیب سب سے پرانی تہذیب ہے یا نہیں، ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی علاقوں میں پائے جانے والے قدیم آثار اور کھدائی سے نکلی ہوئی اشیا اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ اس تہذیب کی جڑیں ولادتِ مسیح سے صدیوں پہلے کی ہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کا مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اگر یہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب نہ ہو تب بھی اس کے مطالعہ سے قدیم ترین تہذیب و تمدن تک پہنچنے میں براہِ راست مدد ملتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ ابوالریحان محمد بن احمد البیرونی اس تہذیب و تمدن کے اتنے زیادہ شائق تھے کہ اس تہذیب کو سمجھنے کے لیے انھوں نے اس خطہ میں طویل مدت تک قیام کیا اور اپنے مشاہدات و معلومات قلم بند کیے۔

ہندوستانی تہذیب و تمدن پر علمائے عالم میں سے البیرونی نے ہی سب سے پہلے قلم نہیں اٹھایا جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب الہند کے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی متعدد اصحابِ علم و دانش نے اس خطۂ عالم سے متعلق کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی دور میں علومِ ہند پر بعض کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور اہلِ عرب طبِ ہند اور ہیئتِ ہند سے یونانی طب و ہیئت سے پہلے شناسا تھے۔ منکا اور سالح نے عہدِ ہارونی اور میکہ و ابن دہان نے عہدِ مامونی میں کئی طبی کتابوں کے ہندی سے عربی میں ترجمے کر کے شائع کر دیے تھے اور ہندو ہیئت کی کتاب سدھانت کا ترجمہ تو عہدِ منصوری یعنی ۱۶۲ھ میں ہو چکا تھا اور اسی نے عربوں میں مطالعۂ افلاک کا ذوق پیدا کیا۔ ہندی ہیئت و طب کے علاوہ نجوم کے احکام، خوابوں کی تعبیر، فیافہ شناسی، زراعت اور موسیقی وغیرہ پر

بھی بہت سی تالیفات عربی زبان میں منتقل ہو چکی تھیں اور بیرونی سے پہلے مسلمان ہندوستانی علوم وفنون سے بخوبی آگاہ تھے۔

البیرونی سے پہلے صرف مسلمان ہی ہند اور اہل ہند سے واقف نہیں تھے بلکہ غیر مسلموں نے بھی ہندوستانی تہذیب وثقافت اور مذہب وملت کا البیرونی سے پہلے مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ البیرونی سے پہلے ایک یونانی سفیر نے ۳۰۵ قبل مسیح میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اس کے دورے کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی حکمرانوں کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنا تجارتی راستہ تبدیل کرلیں اور سمندری راستہ کی بجائے بری راہ اختیار کریں۔ اس یونانی سفیر کو اس مقصد کے حصول کے لیے کچھ عرصہ ہندوستان میں مقیم رہنے کا موقعہ ملا اور اس اثنا میں اس نے ہندوستانی تہذیب وثقافت سے خاصی واقفیت حاصل کر لی لیکن اس نے جو کچھ لکھا وہ ہم تک بہت تھوڑا پہنچا ہے۔ اس یونانی سفیر کے بعد دو چینی علما نے پانچویں اور ساتویں صدی عیسوی کے درمیان ہندوستان کا دورہ کیا اور انھوں نے جو معلومات جمع کیں ان میں ہندوستان کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا اور بادشاہوں کی مجلس میں شریک علما اور فلاسفہ کا بھی ذکر کیا۔ لیکن انھوں نے علمی اداروں اور جامعات کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے اس وقت کی مشہور یونیورسٹی ٹیکسلا کا ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر البیرونی کو ان سب پر فوقیت حاصل ہے۔

ا : البیرونی طبعاً ایک فلسفی اور ریاضی دان تھا اور اسے ہندوستان سے دلی لگاؤ تھا۔ جب وہ ہندوستان سے باہر تھا تو اس وقت بھی وہ اس بات کا شدت سے خواہش مند رہا کہ وہ ہندوستان جائے۔ چنانچہ اسے محمود غزنوی کے ساتھ ہند آنے کا موقع مل گیا۔ اس نے نامساعد حالات اور لڑائیوں کی پرواہ کیے بغیر ہندوستان میں قدم رکھا۔ پھر جو امور شوق کے ساتھ انجام دیے جاتے ہیں، ان کے اثرات ونتائج، ان امور سے جو بددلی یا کسی دباؤ کے تحت انجام پائیں، کہیں زیادہ اچھے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ اس لیے البیرونی نے ہندوستانی تہذیب وتمدن پر جو کچھ لکھا وہ اپنے شوق اور اندرونی جذبہ کو تسکین دینے کے لیے لکھا۔

ب : البیرونی نہایت ذہین اور حساس انسان تھا۔ وہ حالات وواقعات کی تہہ تک بہت

جلد پہنچ جاتا تھا۔ مزید برآں وہ یونانی اور دیگر مشہور تمدنوں سے بھی واقف تھا، اس لیے اسے سماج کا تقابل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں جابجا ہندوستانی تہذیب و تمدن کا دوسرے تمدنوں خصوصاً یونانی تمدن اور اسلامی تہذیب سے موازنہ و مقابلہ کرتا ہے۔

ج : البیرونی کو اپنے متقدمین سے زیادہ عرصہ ہندوستان میں قیام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور اس نے اگرچہ ہندوستان کے سارے علاقوں کا دورہ نہیں کیا پھر بھی اسے اکثر حصوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس لیے ہندوستان کے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا وہ کتابوں سے پڑھ کر یا دوسروں سے سن کر نہیں بلکہ اپنے مشاہدے اور علم و تجربے کی روشنی میں لکھا۔

د : البیرونی پہلا مسلمان ہے جس نے پرانوں کو براہِ راست ان کی زبان میں پڑھ کر مسلمانوں کو اس کے مطالب سے آگاہ کیا۔ ممکن ہے پرانوں کی کچھ جزئیات البیرونی سے بھی مخفی رہی ہوں جنھیں بعد میں دیگر محققین نے متعارف کرایا ہو، لیکن والفضل للمتقدم کے مطابق البیرونی کو بہرحال فضیلت اور اس میدان میں اوّلیت حاصل رہے گی۔

ہ : سب سے بڑی بات جو مصنفین کی صف میں البیرونی کو ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو سمجھنے کے لیے سنسکرت زبان سیکھی اور اس میں اعلیٰ درجہ کی مہارت حاصل کی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے سنسکرت سے متعدد کتب کو عربی زبان میں اور متعدد کتب عربی کو سنسکرت زبان میں منتقل بھی کیا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں البیرونی ایسے عالم ہیں جنھوں نے عربی اور ہندوستانی ثقافت کو باہم متعارف کرایا اور عربی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرکے اپنے افکار کو اقوام عالم تک پہنچا دیا، اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

کتاب الہند

البیرونی نے متعدد کتابیں ہندوستان کے بارے میں لکھیں لیکن اس کی ایک تصنیف "کتاب الہند الکبیر یا تحقیق ما للھند من مقولۃ مقبولۃ او مرذولۃ" کو بلند مقام حاصل ہے اور ہندوستانی تمدن پر اس وقت ہمارے پاس صرف یہی کتاب ہے۔ اس لیے

ہمارے اس مقالے میں اسی کتاب کو بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل رہے گی۔

البیرونی کے خیال میں ہندو اعلیٰ پایہ کے فلسفی، نہایت عمدہ ریاضی دان اور ماہر ہیئت تھے، یہی وجہ ہے کہ اس نے محمد التونسی کے الفاظ میں ہند کے صرف طبعی حالات پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

فلم یقتصر البیرونی علی دراسۃ طبیعۃ البلاد و احوال سکانھا و نظم ھیئتھم بل تعدی ذلک الی دراسۃ اللغۃ والاداب فی مختلف بئیسانھا و مناھج البحث و اسالیب الحیاۃ الھندیۃ فی مختلف مظاھرھا۔

اسی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار جرمن مستشرق اور ماہر البیرونی پروفیسر ایڈورڈ سکاڈ نے کیا ہے۔ وہ کتاب الہند کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

اگر اس تصنیف پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور اسے عربی ادب کے آسمان میں اوّل درجے کا چمکتا ہوا ستارہ سمجھ سکتے ہیں تو ہندوؤں کو بھی حق ہے کہ وہ اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں کہ ایک حق پرست علامۂ عصر نے ان کے اجداد کے تمدن کی تصویر جیسی کہ اس نے اپنے زمانے میں پائی تھی، ان کے لیے چھوڑی ہے۔"

البیرونی نے اپنی اس کتاب میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اس زمانے کے رسوم و رواج پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ہم اپنے مقالے میں جن امور کا ذکر کر رہے ہیں انھیں اس وقت کے رواجی قانون کا درجہ حاصل تھا۔ اس لیے البیرونی کے بیان کردہ نکات بہت اہمیت کے حامل ہیں، اور انھیں اس بنا پر بھی اہم سمجھا جاتا ہے کہ یہ ہندوستانی تمدن کے ایسے امور ہیں جو بعد میں آنے والی بہت سی تہذیبوں پر اثر انداز ہوئے۔ چنانچہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ البیرونی کے عہد کی تہذیب و تمدن کا البیرونی کی وساطت سے مطالعہ کیے بغیر تاریخ تمدن کا نہ تو تسلسل قائم رہ سکتا ہے اور نہ بعد میں پیدا ہونے والے تمدنوں پر اس تمدن کے اثرات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

اگرچہ البیرونی کی تحریروں میں تہذیب و تمدن کی کوئی جامع تعریف نہیں ملتی تاہم اس کی نگارشات کے مطالعہ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ فلسفہ کو تہذیب و تمدن کا جزو لاینفک

خیال کرتا تھا۔ جیسا کہ ڈی بوئر نے لکھا ہے وہ فلسفے پر جس سے اسے مسائل مشکلہ کی عقدہ کشائی میں بہت مدد ملتی تھی، اس کی توجہ ہمیشہ مبذول رہتی تھی۔ اس لیے البیرونی کے خیال میں فلسفہ تہذیب و شائستگی کا جزو لاینفک ہے۔" یہی وجہ ہے کہ البیرونی نے تمدن کو بھی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہر مسئلہ و تمدن کی ایک ماہر فلسفی کی طرح پہلے تمہید بیان کی ہے پھر اس کی جزئیات پر بحث کی ہے۔ آئیے اب ہم البیرونی کی بیان کردہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا مختصراً جائزہ لیں۔

سماجی حالات

ہندوؤں میں ذات پات کا سوال البیرونی کے وقت میں بھی زوروں پر تھا اور معاشرہ جس انداز سے تقسیم تھا اس کے بارے میں البیرونی لکھتے ہیں:

ان الهنادكة يقسمون الخلائق الى اجناس ثلاثة هى الروحانيون فى الاعلى والناس فى الوسط والحيوانات فى الاسفل، ولا يكتفون بذلك حتى يسلكوا ابناء جنسهم فى طبقات اربع، عليا ها البراهمة وهو تقاوة الجنس ولذلك صار واخيرة الانس، والطبقة التى تتلوهم هى كشترو رتبتهم عن رتبة البراهمة غير تباعدة جدا، ودونهم "بيش" وهاتان الطبقتان الاخيرتان تتاريتان، واحد هذا الطبقات هى "شودر"

البیرونی نے مندرجہ بالا اقتباس میں ہندوستانی معاشرے کا نہایت عمدگی سے نقشہ کھینچا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں مخلوق خدا کو ابتدائی طور پر تین طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جن اور انسان کو درمیانی درجہ حاصل ہے اور پھر انسان کو انھوں نے چار گروہوں میں بانٹا ہے۔ یعنی برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی سماج ان چار گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس لیے ہندوستانی سماج کو سمجھنے کے لیے ان چاروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں یہ تقسیم کوئی آج کل کی کاشتکار، غیر کاشتکار یا سرمایہ دار اور اشتراکی جیسی تقسیم نہیں تھی بلکہ ان کے ہاں ہر طبقہ مستقل طور پر اپنا وجود رکھتا تھا۔ ان کے ہاں آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ وہ آپس میں شادی بیاہ کرتے تھے، نہ کسی قسم کے

اور تعلقات رکھتے تھے۔ یہی نہیں ہر ایک کے فرائض بھی الگ الگ تھے۔

برہمنوں کا طبقہ

البیرونی نے کتاب الہند میں دو ابواب قائم کیے ہیں، جن میں سے ایک کا عنوان ہے: ما یخص البرھمن و یجب علیہ مدی عمرہ ان یفعلہ" اور دوسرے باب کا موضوع ہے، ما یغر البراھمن من الرسوم فی عمرہ ان دونوں ابواب میں البیرونی نے ہندو معاشرے میں ذات کے تصور کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

برہمن کی زندگی سات سال گزرنے کے بعد چار حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

پہلا حصہ: یہ حصہ آٹھویں سال سے چوبیس سال تک ہوتا ہے۔ بعض نے اس کی حد اڑتالیس سال تک بتائی ہے۔ اس حصہ میں لڑکے کو برہمن کے فرائض سمجھا کر ان کی پابندی کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس کی کمر میں زنار اور گلے میں جنیو پہنایا جاتا ہے۔ یہ مضبوط دھاگے کے نو تاروں سے بنا ہوتا ہے۔ اسے ایک لکڑی دی جاتی ہے جسے وہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ درھبی یعنی گھاس کی انگوٹھی اس کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں پہنائی جاتی ہے۔ اس حصے میں برہمن پر فرض ہے کہ وہ زہد اختیار کرے۔ دنیا کی سیر کرے، گرو کی خدمت کرے۔ وید، اس کی تشریح، علم کلام اور علم قانون سیکھے۔ بھیک مانگے اور صرف پانچ گھروں سے سوال کرے۔ پلاس اور داب کے درختوں پر آگ کی قربانی دے۔

دوسرا حصہ: برہمن کی عمر کا دوسرا حصہ پچیس سال سے پچاس سال تک ہے۔ جبکہ بشن پران میں اس حصہ کی عمر ستر سال تک بیان کی گئی ہے۔ اس دور میں برہمن اپنا گھر بسا سکتا ہے۔ وہ شادی کر کے گرہستی بن سکتا ہے۔ تاہم کتخدائی محض اولاد پیدا کرنے کے لیے کرے اور مندرجہ ذیل طریقوں سے روزی کمائے۔

۱۔ برہمنوں اور کھشتریوں کو تعلیم دے اور اس کام سے حاصل شدہ آمدنی کو اجرت نہیں بلکہ نذرانہ سمجھ کر اسی سے گزر اوقات کرے۔

۲۔ بادشاہوں اور رئیسوں سے مانگے۔

۳۔ درخت سے پھل توڑے یا زمین سے چنے۔

۴- برہمن صرف کپڑے یا سپاری کی تجارت کرسکتا ہے۔ برہمن پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوتا۔

تیسرا حصہ : یہ حصہ پچاس سال سے پچھتر سال کی عمر پر مشتمل ہے جبکہ بشن پران میں نوے سال تک محیط ہے۔ اس دور میں برہمن پر لازم ہے کہ وہ ترکِ دنیا کرکے جنگل کی زندگی اپنائے اس کی بیوی اس کے ساتھ جنگل میں رہنا پسند کرے تو اپنے بچوں کے ساتھ رہے۔ اب وہ چھت کے نیچے نہیں رہتا بلکہ درختوں کے پتوں سے جسم کو ڈھانپتا ہے۔ بغیر بستر کے زمین پر سوتا ہے۔ ساگ پات اور ان کی جڑیں کھاتا ہے۔ بال وناخن نہیں کٹواتا اور نہ ہی سر میں تیل ڈالتا ہے۔

چوتھا حصہ : یہ حصہ آخر عمر تک رہتا ہے۔ برہمن پر لازم ہے کہ اس حصہ میں وہ دھیان یعنی فکر میں مگن رہے۔ دل کو دوستی، دشمنی سے پاک کرے۔ غضب وشہوت کو دل سے نکال دے۔ گاؤں میں ایک دن اور شہر میں پانچ دن سے زیادہ قیام نہ کرے اور مکتی یعنی نجاتِ ابدی کی تلاش میں رہے۔

برہمن پر صدقہ کرنا، قربانیاں دینا، آگ کی نگرانی کرتے رہنا بھی لازم ہے۔ وہ ہر روز تین بار غسل کرے تاکہ پاک ہوکر اس میں روحانی استعداد پیدا ہوسکے۔ برہمن کو زندگی بھر دن میں دو مرتبہ کھانا کھانا چاہیے۔ اپنا پانی کا برتن علیحدہ رکھے۔ اس کا برتن کوئی دوسرا استعمال کرلے تو وہ اسے توڑ ڈالے۔ برہمن پر لازم ہے کہ وہ ایسے ملک میں رہے جو اتر طرف سے دریائے سندھ اور دکن طرف سے دریائے چرمنت کے درمیان واقع ہو۔ برہمن پر نص صریح کے تحت پانچ قسم کی سبزی حرام ہے۔ یعنی پیاز، لہسن، کدو، کرنجش (ایک قسم کی جڑ جو مولی ہی ہوتی ہے) اور تالی (ایک ترکاری جو تالابوں کے کنارے ہوتی ہے)۔

اس تفصیل سے ایک بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ البیرونی کے ہندوستان میں ذات کی بنا پر برہمن کو نہایت اعلیٰ درجہ حاصل تھا۔ اور زندگی کا سارا نظام اسی ذات پات کے گرد گھومتا تھا، جس میں برہمن کو الگ مقام حاصل ہے اور دیگر تمام طبقے برہمن کی کسی نہ کسی طرح سے اطاعت کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسرے طبقے

البیرونی نے برہمنوں کے علاوہ دیگر تمام طبقوں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ

البیرونی لکھتے ہیں :

کھشتری وید پڑھ اور سیکھ سکتا ہے لیکن اس کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ آگ کے لیے قربانی کرسکتا ہے۔ پُران کے احکام پر عمل کرسکتا ہے۔ اس کا چوکا مثلث ہونا چاہیے جبکہ برہمن کا چوکا مربع ہوتا ہے۔ اسے لوگوں پر حکومت کرنا چاہیے اور ان کی طرف سے جنگ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ اسی کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور پورے بارہ برس کی عمر ہونے پر اس کو ایک جنیو تین دھاگے کی اور ایک فرد موٹے کپڑے کی پہننا چاہیے۔

ویش کا کام، کاشتکاری، مویشی کی رکھوالی، مکان بنوانا اور برہمنوں کی حاجتیں پوری کرنا ہے۔ اس کو دو دھاگے کا صرف ایک جنیو پہننا جائز ہے۔ شودر کی حیثیت برہمن کے غلام کی ہے۔ اس کو برہمن کی خدمت میں مصروف رہنا چاہیے۔ وہ شدید افلاس میں رہتا ہے۔ جنیو نہیں پہن سکتا۔ صرف ایک فرد موٹے کپڑے کی پہن سکتا ہے۔ ہر وہ کام جو برہمن کے لیے مخصوص ہے مثلاً مالا جپنا، بید پڑھنا اور آگ کی قربانیاں دینا منع ہے۔ اگر شودر یا ویش کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ اس نے بید پڑھا تو برہمن اس کی اطلاع حاکم کو دے اور حاکم اس کی زبان کاٹ لے۔ جو شخص ایسا کام کرے جو اس کے طبقے کا کام نہیں ہے تو وہ گنہگار یا مجرم ہے۔ لیکن یہ جرم چوری سے کم ہے۔

ہندوستانی سماج میں ذات پات کے تصور کو اس حد تک دخل رہا کہ ایک طبقہ اپنے کو دوسرے طبقہ سے بالکل الگ تصور کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں چار الگ الگ ذہنیتیں ابھریں اور معاشرے میں کوئی یک جہتی نہ پیدا ہوسکی۔ بلکہ سماج چار ایسے گروہوں میں تقسیم ہوگیا، جن میں انسان اپنے اصلی مقام سے ہٹ گیا۔

رسوم و رواج

البیرونی نے ہندو معاشرے میں شادی و طلاق وغیرہ اور وراثت سے بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے ہاں بیاہ کم سنی میں ہوتا ہے۔ بچے کے والدین یہ تقریب انجام دیتے ہیں۔ اس تقریب میں برہمن قربانی کی رسمیں ادا کرتے ہیں۔ برہمن اور غیر برہمن کو خیرات بانٹی جاتی ہے اور خوشی کے باجے بجائے

جاتے ہیں۔ ان کے ہاں مہر مقرر نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی حیثیت کے مطابق عورت کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ جو کچھ بھی دینا ہوتا ہے شادی کے وقت ہی دے دیا جاتا ہے جو کسی حالت میں بھی واپس نہیں کیا جاتا۔

ہندو معاشرے میں شادی کے بارے میں عجیب و غریب قانون پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان الاجانب افضل من الاقارب، وما کان البعد فی النسب من الاقارب فھو افضل مما قرب فیہ "۔ ہندو معاشرے میں اگرچہ شادی بیاہ کے سلسلہ میں کفو کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کے ہاں مسلمانوں اور دیگر معاشروں کے برعکس کفو کی شرائط میں سے یہ شرط نہایت اہم ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی بجائے دور کے رشتہ داروں میں شادیاں رچائی جائیں۔ ان کے ہاں محرمات کی فہرست میں سلسلہ نسب میں نیچے اور اوپر کی طرف آنے والے لوگ سام ہوتے ہیں۔ اسی طرح بھتیجی، بھانجی، خالہ، پھوپھی اور ان کی بیٹیاں حرام قرار پاتی تھیں۔ تاہم جب نسلیں پانچ پشت تک دور ہو جائیں تو یہ حرمت کراہت میں بدل جایا کرتی ہے۔

اس سماجی قانون میں بھی ان کے ہاں ذات پات کا اثر پایا جاتا تھا۔ چنانچہ شادیوں کی تعداد طبقات کے لحاظ سے کم و بیش تھی۔ برہمن چار، کھشتری تین، ویش دو اور شودر ایک ہی شادی کر سکتے تھے۔ ہر شخص اپنے یا اپنے سے نچلے طبقے میں شادی کر سکتا تھا اپنے سے اونچے طبقے میں ہرگز شادی نہیں کر سکتا تھا۔

ہندو معاشرے میں طلاق کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ ایک بار شادی ہو جانے کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان موت کے سوا اور کسی بھی طرح سے تفریق نہیں ہو سکتی اور شوہر کی وفات کے بعد عورت کو عقد ثانی کرنے کا ہرگز ہرگز حق حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت کو اپنانا پڑتا۔ زندگی بھر بیوہ رہے یا اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہو جائے یعنی شوہر کے ساتھ ہی جل جائے لیکن عورت کے لیے جل جانا ہی بہتر خیال کیا جاتا تھا۔ اسی لیے راجاؤں کی بیویوں کو جلا دیا جاتا تھا چاہے وہ جلنا چاہیں یا نہ چاہیں۔ یہ ایک ایسی رسم تھی جس نے عورت کی زندگی کو اجیرن کر کے رکھ دیا تھا۔ خاص ایام میں عورت ناپاک تصور

کی جاتی تھی۔ وہ کسی برتن کے پاس نہ جاتی، نہ ہی اس کے گھر سے کھانا جاتا تھا۔ خاص ایام کی مدت بھی برہمن و شودر کے لیے کم و بیش تھی۔

اولاد ماں کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ باپ کی طرف بیٹوں کی نسبت نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بیوی برہمن ہوتی تو اولاد برہمن اور بیوی شودر ہوتی تو اولاد شودر کہلاتی تھی۔ ایام حمل میں دوسری اور وضع حمل پر تیسری قربانی کی جاتی تھی۔ اس کے بعد لڑکے کا نام رکھا جاتا تھا۔ اور بچے کا نام رکھنے کی قربانی دی جاتی تھی۔ رضاعت کی مدت زیادہ سے زیادہ تین برس تھی جس کی پابندی لازمی نہ تھی۔ عقیقہ تیسرے برس ہوتا تھا اور کان ساتویں آٹھویں برس چھیدا جاتا تھا۔

ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار میں مُردوں کے ساتھ مختلف سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ ابتدائی زبانوں میں مردوں کے بدن کو آسمان کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ انھیں میدانوں میں کھلا ہوا ڈال دیا جاتا تھا، بیماروں کو بھی پہاڑوں اور صحراؤں میں ڈال دیا جاتا تھا، اگر وہ لوگ مر جاتے تو وہیں پڑے رہتے اور اگر تندرست ہو جاتے تو خود ہی گھر آ جاتے۔ اس کے بعد کے دور میں اس طریقے (یہ) ایک تبدیلی کی گئی اور حکم دیا گیا کہ بدن ہوا کے حوالے کیے جائیں۔ چنانچہ لوگوں نے ایسے گھٹ بنائے جن پر سوراخ دار دیواروں کے ساتھ چھت ہوتی تھی جن سے بدنوں کو ہوا لگتی رہتی تھی جیسا کہ مجوسیوں کے مقبروں کا (جنھیں ذخمہ کہا جاتا ہے) حال ہوتا ہے۔ یہ طریقہ زمانۂ طویل تک رائج رہا۔ یہاں تک کہ نارائن نے بدن کو آگ کے حوالے کرنے کا قاعدہ مقرر کیا۔ اس وقت سے ہندو لوگ مُردوں کو جلا دیتے ہیں۔ جس سے نہ تو بدن میں گندگی، سڑن یا بدبو پیدا ہوتی ہے اور نہ ایسے آثار و نشان باقی رہتے ہیں جن سے اس کی یاد ستائے۔

ہندوؤں کا خیال ہے کہ انسانی جسم میں ایک نقطہ ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اور جب انسانی بدن کے اجزا جل کر منتشر ہو جاتے ہیں تو وہ نقطہ خالص ہو کر باقی رہ جاتا ہے۔ اس غیر فانی روح کے رجوع (آسمان پر لوٹنے) کے بارے میں ہندوؤں کا خیال یہ ہے کہ کوئی روح سورج کی شعاع کے ساتھ واپس جاتی ہے اور کوئی روح آگ کے شعلے کے ساتھ

لپٹ جاتی ہے جو اُسے اوپر چڑھا کر لے جاتا ہے۔

ہندو مردے کا وارثوں پر یہ حق ہوتا ہے کہ اس کو غسل دے کر عطر لگائے اور صندل یا لکڑی سے جو میسر ہو جلائے اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی خاک کا کچھ حصہ دریائے گنگا میں بہا دے اور باقی خاک کسی بھی ندی میں ڈال دی جائے۔ جلانے کی جگہ پر وہ لوگ سنگ میل کے مشابہ ایک پکی قبر بنا دیتے ہیں اور اس پر چونا کاری کرتے ہیں۔ اسی خاک کے بہانے سے گوتم بدھ نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ مُردوں کو بہتے ہوئے پانی میں چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ بدھ مت کے پیرو اپنے مُردوں کی لاشوں کو دریا میں بہا دیتے ہیں۔ یہیں سے شودر اور ویشوں وغیرہ نے کسوف کے وقت اپنے کو دریا میں ڈبو کر ہی زندگی سے چھٹکارا پانے اور اپنے کو فضیلت کے مقام پر پہنچانے کا طریقہ اختیار کیا۔

ہندو معاشرے میں میت پر سوگ کرنے کا بھی عام رواج ہے۔ اگر وارث بیٹا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ پورا سال سوگ اور غم منائے، اپنی زوجہ سے پرہیز کرے، اور سوگ کی ابتدا میں کم از کم مقررہ دن تک کھانا حرام تصور کرے۔ وارث پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ پہلے سال میں سولہ ضیافتیں دے۔ یہ ضیافتیں موت کے گیارھویں اور پندرھویں دن اور اس کے بعد ہر مہینہ میں ایک مرتبہ دی جاتی ہیں۔ ایک کھانا سال ختم ہونے سے ایک دن پہلے دیا جاتا ہے۔ یہ میت اور اس کے باپ دادا کا کھانا ہوتا ہے۔ پھر اختتام سال کا کھانا دیا جاتا ہے۔ ان ضیافتوں میں کھانا کھلایا جاتا اور صدقہ دیا جاتا ہے۔ سولہ ضیافتوں اور صدقوں کے علاوہ یہ بھی واجب ہے کہ گھر کے دروازے کے اوپر دیوار سے نکلی ہوئی ایک برآمدہ نما جگہ بنائیں جس پر مرنے کے دن سے دس روز تک پکا ہوا کھانا اور پانی کا کوزہ رکھیں۔ شاید روح کو ابھی کسی جگہ قرار نہ ہوا ہو اور وہ بھوک پیاس سے گھر کے ارد گرد چکر لگا رہی ہو۔ اگر ایسا ہو تو وہ یہاں تسکین حاصل کر سکے گی۔ پھر دسویں دن میت کے نام پر بہت سا کھانا اور ٹھنڈا پانی صدقہ کریں اور گیارھویں دن کے بعد سے ہر روز ایک آدمی کا کھانا اور ایک سکہ کسی برہمن کے گھر بھجواتے رہیں۔ یہ پورا سال بھیجتے رہیں۔ ختم سال پر یہ سلسلہ بند کر دیں۔

ہندوستانی سماج میں وراثت کے کچھ اشارے بھی ملتے ہیں۔ وراثت کے بارے میں ان کے ہاں جو موٹے موٹے اصول رائج ہیں، ان کے مطابق بیٹی کے علاوہ تمام عورتیں وراثت سے محروم قرار پاتی ہیں اور منو کی کتاب میں وضاحت کی گئی ہے کہ بیٹی کا حصہ بیٹے کے حصے کا ایک چوتھائی ہے۔ اگر بیٹی غیر شادی شدہ ہے تو شادی کے وقت اس کے حصہ سے اس پر خرچ کیا جائے گا۔ شادی کے بعد اس کا خرچ بند کر دیا جائے گا۔ بیوی اگر ستی نہیں ہوئی تو تاحیات وہ بھی وارث ہوگی۔ وارثوں کے بارے میں، جو صرف مرد ہی ہو سکتے ہیں، یہ اصول ہے کہ بہت نیچے والوں کا بہت اوپر والوں سے زیادہ حق ہے۔ یعنی پوتے اور بھانجے کو دادا اور نانا پر ترجیح دی جائے گی۔ جب کوئی وارث نہ ہو تب ضعیف وارث یعنی بھائی وغیرہ کو وراثت ملے گی۔ اگر ایک ہی جنس کے متعدد وارث ہوں تو سب میں ترکہ برابر برابر تقسیم ہوگا۔ ہندوؤں میں مخنث کو بھی مردوں میں شامل قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح میت کا قرض بھی وارث کے ذمہ ہوتا ہے خواہ میت کے چھوڑے ہوئے مال سے ادا کرے یا اپنے پاس سے۔ وارث پر قرض کی ادائی لازم ہے، خواہ میت نے کچھ چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو۔ اسی طرح میت کی بیٹی اور بیوی کا خرچ بھی وارث پر ہر حال میں لازم ہے۔

ہندوستانی معاشرے پر چونکہ بت پرستی چھائی ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی تقاریب، میلوں، عیدوں، خوشی کے دنوں اور اجتماعات پر بُت پرستی کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ ان کی اجتماعی تقریب چاہے وہ کسی بھی مہینہ میں یا کسی بھی وجہ سے ہو اس میں بت کو پوجنا، بت کو کھانا پیش کرنا، بت کو سجدہ کرنا، بت کے نام پر صدقہ دینا ضرور شامل ہوتا ہے۔

ان جملہ رسوم کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں عدالتی نظام بھی پایا جاتا تھا جس کی صورت اگرچہ آج جیسے نظامِ عدالت کی طرح منظم نہیں تھی۔ پھر بھی چند اشارے ملتے ہیں جن پر ان کے عدالتی نظام کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ منصف مدعی سے لکھا ہوا دعویٰ طلب کیا کرتا تھا اور مدعی، مدعا علیہ کے خلاف تحریری شکل میں اپنا دعویٰ مع دلائل یا گواہی کے ساتھ پیش کیا کرتا تھا۔ گواہوں کی تعداد چار سے کم نہیں ہوا کرتی۔ منصف خفیہ تحقیقات و ظاہری

ثبوت سے استدلال اور واقعاتِ معلومہ پر دوسری باتوں کا قیاس کرنے اور اصل بات کو سمجھنے کی پوری کوشش کر کے فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اگر مدعی ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہوتا تو منکر پر حلف اٹھانا واجب ہوتا تھا اور منصف مدعی سے حلف لے سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دعوے کے اعتبار سے حلف کی کئی اقسام تھیں جن میں پانچ برہمن عالموں کے سامنے اپنے نیک اعمال کے ثواب سے دست برداری سے لے کر تپتے ہوئے گرم لوہے کا ٹکڑا ہاتھ پر رکھنے تک شامل تھے۔ اس عدالتی نظام کے متعلق چند اشاروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ انصاف کے حصول کے لیے پوری پوری کوشش کیا کرتے تھے۔

ہندوستان کے بارے میں البیرونی کے بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن سے براہِ راست بخوبی آگاہ تھا اور اس کا علم کسی کتاب سے یا کسی شخص سے حاصل کیا ہوا نہیں بلکہ اس کے اپنے مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے۔

قوانینِ اسلام کا نفاذ، قرآن اور سنت کی روشنی میں

از سید یعقوب شاہ

قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی قوانین کا کیا مفہوم ہے اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی کیا صورت ہے۔ اس کتاب میں اس اہم مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ پھر اسلامی قوانین کی تنفیذ کی راہ میں بعض حلقوں کی طرف سے کسی نہ کسی انداز میں جن مشکلات کا اظہار کیا جاتا ہے کتاب میں ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور ان مشکلات و مسائل کا حل قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

صفحات : ۳۳۶ + ۳۰ قیمت : گیارہ روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور